# باب اول

## خودنوشت: فن اور روایت، ایک اجمالی جائزہ

## خودنوشت: تعریف ومفہوم

اللہ تعالیٰ نے انسان کو بے شمار کمالات، مختلف صلاحیتوں اور قوتوں سے نوزا ہے۔ اس بنا پر وہ اپنی ذات اور اپنی صلاحیتوں کی خواہشِ نمود بھی رکھتا ہے اور اپنے آپ کو نمایاں بھی کرنا چاہتا ہے۔ یہ چیز اسکی جبلت میں رکھ دی گئی ہے۔ وہ یہ چاہتا ہے کہ اس کو نظر انداز نہ کر کے اسکی ذات وصفات کا اعتراف کیا جائے۔ اس خودنمائی کے نفسیاتی عوامل مختلف ہوتے ہیں جیسے دوسروں کو متاثر کرنا، مرعوب کرنا یا مستفید کرنا۔ اسی طرح دوسروں کے سربستہ رازوں کو جاننے کی خواہش بھی انسانی فطرت اور جبلت کا اہم خاصہ ہے۔ خودنوشت لکھنا اور پڑھنا بھی اسی طرح لازم وملزوم ہے یعنی جہاں ایک طرف خودنوشت نگار قارئین کو اپنی ذات سے آگاہ کرانا چاہتا ہے تو وہیں دوسری طرف قارئین بھی کسی کامیاب، متاثر کن اور اپنے سے بالاتر شخصیت کی زندگی کے بارے میں جاننا پسند کرتے ہیں۔

خودنوشت اُردو کے نثری اصناف میں ایک اہم مقام رکھتی ہے۔ یہ ایک ایسی صنف ہے جو خود نوشت نگار کو نزدیک سے جاننے کا بہترین ذریعہ ہے۔ یہ مصنف کی مکمل داستانِ زندگی اور دستاویز زیست ہوتی ہے۔ جس میں وہ اپنی ولادت، تعلیم وتربیت، خاندانی پس منظر، ماحول، اپنے حالات، کمالات، تجربات، عادات، خیالات، احساسات، جذبات، مشاہدات، خدمات، معاشرت، ازدواجی زندگی، اولاد احباب اپنے عہد کے سیاسی، سماجی، مذہبی، تعلیمی، ادبی، ملی، قومی، ملکی، بین الاقوامی حالات و واقعات کو ادبی پیرایہ اور اُسلوب میں قلمبند کر کے پیش کرتا ہے۔ یوں خودنوشت مصنف کی داخلی اور خارجی زندگی کی آئینہ دار ہوتی ہے۔ اس میں مصنف ان باتوں کا ذکر زیادہ اہتمام سے کرتا ہے جنہوں نے اسے شعوری یا لاشعوری طور بہت متاثر کیا ہوتا ہے۔ یعنی جو باتیں خودنوشت نگار کے دل ودماغ میں ہوتی ہیں وہی چیزیں خودنوشت میں ظاہر ہوتی ہیں۔ فارسی کے ایک محاورے سے اس بات کی خوب وضاحت

ہوتی ہے کہ ہر چہ درد دیگ است بہ چمچہ می آید (جو دیگ میں ہے وہی چمچے میں آتا ہے)۔ خودنوشت نہ صرف مصنف کی نفسیاتی گرہوں اور اُلجھنوں کو سمجھنے میں معاون بنتی ہیں بلکہ یہ کسی عہد کی نفسیاتی کشمکش کی گرہیں کھولنے میں بھی مددگار ثابت ہوسکتی ہے۔ اس طرح ادیب، ادب اور عہد کی نفسیات کی فہمائش آسان ہو جاتی ہے۔

خودنوشت جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے، خود سے یا اپنے آپ سے لکھی ہوئی تحریر ہے۔

آکسفورڈ ڈکشنری میں اس کی تعریف یوں رقم ہوئی ہے:

"the story of one's life,written by him self"(1)

''کسی شخص کی زندگی کی کہانی خود اس کی لکھی ہوئی۔''

یعنی خودنوشت اپنی زیست کو کاغذ کے صفحے پر بکھیر دینے کا نام ہے۔ خودنوشت سوانح حیات میں مصنف کی ذات ہی مصدر، منبع، ملجا، ماخذ اور مرجع ہوا کرتی ہے۔ اس نامۂ اعمال کے لیے وہ خود مجرم، خود گواہ اور خود جج کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس میں چونکہ مطمحِ نظر، ہیرو یا کردار کی شخصیت ہوتی ہے اس لیے روشنی کا حلقہ ابتدا سے آخر تک مصنف کی ذات کو احاطے میں لیکر جگمگاتا رہتا ہے۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ دیگر اشخاص یا دوسروں کے واقعات کا خودنوشت میں در آنا بھی قدرتی عمل ہے لیکن ان کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ اس سے مصنف کے بشمول اسکے عہد اور ماقبل کے عہد کے سیاسی، سماجی، ادبی، مذہبی، معاشی، معاشرتی، ملکی اور بین الاقوامی منظر نامے سے بھی واقفیت ہو جاتی ہے جو کسی صورت خالی از نفع نہیں سمجھی جاسکتی۔ لہذا جن باتوں کا بھی مصنف ذکر کرتا جاتا ہے ان سے طرح طرح کے پردے اٹھتے جاتے ہیں جو بہت سی حقیقتوں کو آشکار کرتے ہیں۔ اس سے انفرادی اور اجتماعی لاشعور تک رسائی آسان ہو جاتی ہے۔ غرض خودنوشت میں ہر بیان کی جانے والی بات کی اپنی جگہ اہمیت ہوتی ہے اور کہیں نہ کہیں یہی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو ایک مصنف کی شخصیت کی تشکیل کے پیچھے کارفرما رہ چکی ہوتی ہیں۔

رائے پاسکل اس حوالے سے کچھ یوں فرماتے ہیں:

''خودنوشت سوانح عمری میں زندگی کے کسی حصّہ کو ان حقیقی حالات کے تحت دہرایا جاتا ہے جن میں ان واقعات نے جنم لیا......خودنوشت سوانح نگار کی ذات ہی اس کا محور ہوتی ہے۔

اس میں روزمرہ کے کاروبار اور اس کے ماحول کی وہ جھلک نظر آتی ہے جس میں مصنف کی شخصیت کی تشکیل ہوتی ہے''۔(۲)

خودنوشت سوانح عمری کی تعریف کے بارے میں علماء زبان، اہل علم اور دانشوروں کی رائیں مختلف ملتی ہیں، انسائیکلوپیڈیا بریٹینکا میں خودنوشت سوانح حیات کی یوں تعریف کی گئی ہے:

"Autobiography is a very close relative or special form of biographical literature.It is the life of a man that happens to have been written by him self and is there fore unfinished"

''خودنوشت، سوانح ادب کی ایک اہم صنف ہے۔ یہ کسی شخص کی روداد زندگی ہوتی ہے۔ جو اسکی خود کی لکھی ہوتی ہے۔ لہذا یہ اپنے آپ میں اختتام کے حوالے سے نا تمام ہوتی ہے۔''(۳)

انسائیکلوپیڈیا آف ورلڈ لٹریچر میں خودنوشت سوانح حیات کی تعریف ان الفاظ میں کی گئی ہے:

"Autobiography is the narrative of man's life by him self.It should contain a greater guarantee of truth than any other form of biography since the central figure of the book appears also a witness of the events which he records"(4)

''خودنوشت کسی انسان کی زندگی کی وہ روداد ہے جسے وہ خود بیان کرے اس میں سوانح حیات کی کسی بھی دوسری شکل سے زیادہ صداقت کی ضمانت ہونی چاہیے کیونکہ کتاب کی مرکزی شخصیت ایسے گواہ کے طور پر بھی پیش ہوتی ہے جنھیں وہ خود قلم بند کرتا ہے۔''

وہیں انسائیکلوپیڈیا امریکہ میں جو خصوصیات اور تعریف اس حوالے سے مذکور ہے وہ اس طرح ہے:

"Autobigraphy is literally a man's recording of his own life.Auto biography has been provoked by a variety of motive,it may be confessional in which the motive is unburden one's self of a feeling of guilt

apologetic,in which the written attempts to declare and to justify the course of his life or a particular action there of exporatory when he uses the act of writting as an instrument of research and a probing into his own highest un examined behavioural patterns,or simply egocentric portriature when the writter assumes that his life is worth sharing with others."(5)

''خودنوشت سوانح عمری درحقیقت ایک شخص کی اپنی زندگی کی تحریر ہوتی ہے۔جس کے متعدد محرکات ہوتے ہیں۔یہ ایسی تحریر ہوسکتی ہے جس کا مقصد جرم یا افسوس کے جذبات سے نجات حاصل کرنا ہو۔جس میں لکھنے والا اپنے دورِ حیات یا کسی خاص عمل کا جواز پیش کرتا ہے یا کسی عمل کا اقرار کرتا ہے۔لکھنے والا جب تحریر کا آغاز کرتا ہے تو وہ اکثر و بیشتر ایسے نمونوں کو پیشِ نظر رکھتا ہے جس کی اس نے اب تک تحقیق کی ہو یا اس کا جائزہ لیا ہو۔وہ انا پرستی کا ایسا نمونہ پیش کرتا ہے جس کی وجہ سے لکھنے والا سمجھتا ہے کہ اس کی زندگی بھی باقی لوگوں کی زندگی سے مشابہت رکھتی ہے۔''

اُردو محققوں کی آرا بھی اس سلسلے میں گراں قدر ہیں چنانچہ ڈاکٹر مظہر مہدی اس حوالے سے یوں اظہارِ خیال فرماتے ہیں:

''خودنوشت سوانح میں اظہارِ ذات،تاریخی صداقت،جمالیاتی کیفیت اور ادبیت کی موجودگی لازمی ہے۔یہ ایک بیانیہ اور نیم تخلیقی صنف ادب ہے۔اس کی زبان تخلیقی اور ادبی ہوتی ہے۔جذبات کے اظہار کا انداز ضرورت اور موقع کے لحاظ سے بدلتا رہتا ہے۔اس میں مصنف کبھی حزنیہ،کبھی مزاحیہ،کبھی خطیبانہ اور کبھی سنجیدہ انداز اختیار کرتا ہے۔''(۶)

ڈاکٹر رفیع الدین ہاشمی آپ بیتی کی ان الفاظ میں تعریف کرتے ہیں:

''آپ بیتی محض احوال و واقعات کا مجموعہ نہیں ہوتی بلکہ اکثر اوقات لکھنے والوں کی داخلی کیفیتوں،دلی احساس،شخصی اور علمی تجزیوں،زندگی کے جذباتی پہلوؤں اور بحیثیت مجموعی زندگی کے بارے میں اس کے نقطہ نظر کی ترجمانی کرتی ہے۔''(۷)

محمد طفیل کے یہاں خودنوشت کی تعریف اس طرح ملتی ہے:

''آپ بیتی کسی انسان کی زندگی کے تجربات، مشاہدات، محسوسات، نظریات اور عقائد کی ایک مربوط داستان ہوتی ہے جو خود اس نے بے کم و کاست اور راست قلم بند کردی ہو۔ جسے پڑھ کر اس کی زندگی کے نشیب و فراز معلوم ہوں۔ اس کے نہاں خانوں کے پردے اُٹھ جائیں اور ہم اس کی خارجی زندگی کے سوا اس کے داخلی کیفیات کے حجرے میں جھانک سکیں۔'' (۸)

عبدالمجید قریشی اپنا اظہار خیال آپ بیتی کے سلسلے میں ان الفاظ میں پیش کرتے ہیں:

''آپ بیتی یا خودنوشت سوانح حیات وہ کتاب ہے جس کے اوراق میں انسان حیات مستعار کے مختلف ادوار کو بلا کسی تکلیف اور تصنع کے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے کہ اس نے کن حالات میں اس جہانِ رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں، کس طرح وہ طفل شیر خوار سے لڑکپن کی منزل میں داخل ہوا، اس کا زمانۂ طالبِ علمی کیسے بسر ہوا، عروس شباب نے کیونکر اسے خوش آمدید کیا، زندگی میں کامرانیوں اور کامیابیوں نے کیسے اس کا خیر مقدم کیا۔ ان کے ساتھ تلخیاں محرومیاں اور ناکامیاں کیسے اس کی راہ میں سنگ ہائے گراں بن کر حائل ہوئیں اور کس طرح وہ ان گردابِ بلا سے اپنی کشتیِ حیات کو بچاتا ہوا نکلا۔ زندگی میں کن آدمیوں سے اس کا سابقہ پڑا اور ان کے متعلق اس کی آرا اور تاثرات کیا ہیں۔ اس زمانے کا طرزِ معاشرت اور رہن سہن کیسا تھا اور رسم و رواج کی کیا کیفیت تھی غرض آپ بیتی کے روپ میں ایک دور کی ہماہمی اور گہما گہمی پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔'' (۹)

اُردو خودنوشت کے حوالے سے ایک بڑا معتبر نام ڈاکٹر وہاج الدین علوی کا بھی ہے وہ اس کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''خودنوشت سوانح حیات ادب کی وہ تخلیقی صنف ہے جو کسی فردِ واحد کی زندگی کے اہم ادوار پر محیط ہوتی ہے اور اسی کے قلم کی رہینِ منت ہوتی ہے۔ جس کے آئینہ میں اس فرد کی داخلی اور خارجی زندگی کا عکس براہِ راست نظر آتا ہے اور اس کا عہد بھی جلوہ گر ہوتا ہے۔'' (۱۰)

مندرجہ بالا تعریفوں اور آرا سے جو نکات ابھر کر سامنے آتے ہیں ان کو یوں اختصار کے ساتھ بیان کیا جاسکتا ہے:

۱۔خودنوشت کسی انسان کی داستانِ حیات ہوتی ہے۔جو اس نے خود صفحۂ قرطاس پر بکھیری ہوتی ہے۔

۲۔خودنوشت کی اہم خوبی صداقت و حق گوئی ہے۔یہ بھی مناسب نہیں مصنف اپنے سارے راز آشکار کرے یا جو چیز ضروری نہیں ہے اُنکا بیان کرے لیکن قارئین اتنی امید تو خیر رکھتے ہیں جو کچھ بیان کیا گیا ہے،وہ سچائی کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔

۳۔خودنوشت سوانح حیات مصنف کی ذات کا آئینہ ہوتا ہے لہذا اس میں اسکے احساسات،مشاہدات، تجربات،خیالات اور جذبات منعکس ہوتے ہیں۔

۴۔خودنوشت سوانح حیات میں مصنف کا اپنا طور طریق،مزاج اور اُسلوب ہوتا ہے۔وہ اپنے خیالات دوسروں کے ساتھ اشتراک کر کے اپنی انا کی تسکین کرتا ہے اس حوالے سے وہ اکثر جرأت کا مظاہرہ کرتا ہے۔

۵۔خودنوشت سوانح حیات موت کی وجہ سے نامکمل رہ جاتی ہے کیونکہ حالتِ نزع کے عمل کو تحریر اً نا ممکن نہیں رہتا ہے۔

۶۔خودنوشت میں زندگی کے تمام تر واقعات کو بیان نہیں کیا جا سکتا نہ اسکی ضرورت ہوتی ہے اس میں صرف وہی واقعات قلم بند کیے جاتے ہیں جو حافظے کی بار بار گھنٹی بجاتے ہوں اور جنکا کہنا مصنف کے لیے اور جاننا قارئین کے لیے سودمند ثابت رہے۔اس میں مصنف کی زندگی کے وہ واقعات اہمیت کے حامل ہوتے ہیں جن سے اسکی اصلی زندگی کے خدوخال اُبھر کر سامنے آئیں۔

۷۔خودنوشت کے آئینے میں مصنف کے ساتھ ساتھ خارجی دُنیا،اسکا عہد،عوام کا اجتماعی لاشعور اور اس وقت کی تاریخ منعکس ہوتی ہے۔

خودنوشت سوانح حیات تحریراً نا بنظرِ ظاہر سہل معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں یہ بہت دشوار عمل اور فن ہے۔اس کا ایک سبب یہ ہے کہ بیتے ہوئے وقت کے واقعات و سانحات،عرصۂ دراز کے بعد دہرانے میں مکمل واقعیت ممکن نہیں رہتی کیونکہ نسیان سے ہر شخص کا سابقہ رہتا ہے اور اسکے دوش بدوش بہت سارے ایسے واقعات بھی ہوتے ہیں جن کی اہمیت وقت کے ساتھ کم ہو جاتی ہے۔مصنف کے خیالات و نظریات میں تبدیلی بھی ممکن ہوتی ہے۔لکھنے والے کی ترجیحات،پسندیدگی میں بھی تغیر کا اغلب

امکان رہتا ہے۔لڑکپن وشباب کی یادیں زیادہ حسین دکھائی دیتی ہیں،لیکن بعض واقعات ایسے حساس اور نازک ہوتے ہیں جن میں مصنف 'اگر گویم زبان سوزد' کے مصداق کئی واقعات پر پردہ ڈالنے میں ہی عافیت محسوس کرتا ہے۔خودنوشت سوانح حیات فی الواقع اگر چہ مصنف کی حیات کا مطالعہ ہے لیکن اس میں مذکورہ باتیں اس کی منزل کو آزمائشی بنا دیتے ہیں۔آل احمد سرور کا قول اسکی خوبصورت وضاحت کرتا ہے،وہ لکھتے ہیں:

''جینا ایک فن ہے اور آپ بیتی فنِ لطیف۔اس سے عہدہ برآ ہونے کے لئے بڑی سچائی بڑے ریاض اور بڑے کھرے پن کی ضرورت ہے۔اس کا راستہ بھی پل صراط کی طرح بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔''(۱۱)

ڈاکٹر ظل ہما کا قول بھی اس حوالے اہمیت کا حامل ہے:

''آپ بیتی تعصب اور تفاخر Pride & Prejudice کے درمیان سے گزرتا ہوا ایک خط ہے جس میں بہت سے پیچ وخم بھی ہوتے ہیں اور ان سے بچ کر گزرنا کوئی آسان کام نہیں۔''(۱۲)

ادب کی کسی بھی نوع میں ایک ادیب اپنے جذبات،مشاہدات،احساسات و تجربات کو اپنے اندازِ اختصاص میں بیان کرتا ہے۔ایک اچھا اور سلیقہ مند انسان اپنی زیست یا اپنے وجود کا تجزیہ ومحاسبہ اوروں کے مقابلے میں بہتر طور اور طریق سے کرسکتا ہے۔'من آنم کہ من دانم' والی بات خودنوشت نگار کے لیے بھی صادق آتی ہے۔اس سے بہتر اسکے خیالات،نظریات،ترجیحات،اُصول،ذہنی اور نفسیاتی کیفیت کا بہتر ادراک خود اسکے علاوہ اور کسے ہوسکتا ہے۔یہی سبب ہے کہ وہ اپنی آپ بیتی کو دوسروں کے برعکس بہتر اور معقول طریقے سے لکھنے کے قابل ہوتا ہے۔

خودنوشت ایک ایسے عالَم کی طرح ہے جسے دوحصّوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے ایک خارجی جہاں ہے جو مصنف کی ذات سے باہر کی باتوں پر مبنی ہوتا ہے اور ایک داخلی کائنات ہے۔جس میں مصنف کی نفسیات،خیالات،نیّت وغیرہ آتی ہے۔خارجی جہاں کا مطالعہ ہر کوئی اپنے مشاہدے کی بنا پر کرسکتا ہے اور اپنا حاصل مطالعہ پھر اوروں کے ساتھ بھی سا جھا کرسکتا ہے لیکن کسی کی داخلی کائنات میں قدم رکھنا انتہائی دشوار گزار بلکہ ناممکن عمل بن جاتا ہے کیونکہ یہ لامحدود اور بحرِ بے کراں کی طرح ایک جہاں

ہوتا ہے۔اس میں کبھی قارئین کے ادراک کا سفینہ کسی درمیانی جزیرے تک تو پہنچ پاتا ہے لیکن مکمل ساحل تک کبھی اس کی رسائی نہیں ہو پاتی۔حیات کا بنیادی موضوع دروں بینی (introspection) ہے اور یہ ایک داخلی فن ہے۔اس میں بیرونِ دنیا کے امکانات کے چشمے اندرونِ دنیا سے ہی پھوٹتے ہیں۔یہ ضخیم بھی ہوسکتی ہے اور مجمل بھی کیونکہ فن کے لیے تعدادِ صفحات کی قید شرط نہیں ہے۔شرط اگر ہے تو وہ یہ ہے کہ کسی بھی فن پارے میں ادبیت پائی جائے اور وہ دلچسپی سے پُر ہو۔یعنی 'جتنا گُڑ ڈالو گے اتنا ہی میٹھا ہوگا' ۔ادب میں جو خودنوشتیں وجود میں لائی گئی ہیں وہ دو طرح کی ہیں۔پہلی صورت کی خودنوشتوں میں بیشتر واقعات خارجی نوعیت کے ہیں۔خودنوشت سوانح نگار اپنی سوانح حیات میں اپنی سرگزشتِ حیات شروع کرکے خارجی دنیا میں کھو جاتا ہے۔اس نوع کی سوانح حیات کی سرحدیں تاریخ سے جا ملتی ہیں۔اسے 'سرگزشت' کہیں گے۔یہ خودنوشت کی پرُانی صورت ہے۔سرگزشت میں مصنف کی وہ منزلت واہمیت نہیں ہوتی جیسے کہ ان لوگوں اور واقعات وسانحات کی ہوتی ہے جن کا تعلق مصنف سے رہا ہو۔خودنوشت سوانح حیات یا آپ بیتی کی جونئی اور پیش رفتہ شکل ہے اس میں مصنف اپنی شخصیت کو ایک ہیرو کے روپ میں قاری کے سامنے رکھتا ہے۔اس میں مصنف زیادہ ان ہی واقعات کا تذکرہ کرتا ہے جن کا رشتہ داخلی زندگی سے رہا ہو۔دوسرے خارجی واقعات جو ضمنی طور در آئے ہوں،ان کے پیچھے بھی اصل منشا خود کی ہی نمود واظہاریت ہوتی ہے۔خودنوشت سوانح عمری ہمارے داخلی واقعات پر مبنی ہو یا خارجی واقعات پر، بہرکیف یہ انسانی ذات سے ہر نوعیت سے منسلک ہوتی ہے،اور انسان کا بہترین مطالعہ انسان کے سوا کیا ہوسکتا ہے؟اس لیے اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا جانا چاہیے۔چنانچہ ڈاکٹر صبیحہ انور بھی اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے ایک جگہ لکھتی ہیں:

> ''خودنوشت سوانح حیات کا تعلق ہمارے شدید داخلی جذبات سے ہے اس لیے اسے فن کی اعلیٰ اقدار میں شامل کیا جائے گا۔''(۱۳)

آپ بیتی لکھتے وقت مصنف خود کا مشاہدہ بھی اس آئینہ میں کرتا ہے۔وہ اپنی ذات کو سمجھنے اور سمجھانے کی ہر سعی کرتا ہے۔قارئین بھی مصنف کی ذات میں خود کو دیکھتے ہیں یا اسکی شخصیت کے ساتھ خود کا موازنہ کرتے ہیں۔انہیں ایک طرح کا حوصلہ اس طرح ملتا ہے یا ایسی معتدل راہ ملتی ہے جس سے وہ

بہتر انداز سے زیست کرنے کا ہنر سیکھ سکتے ہیں اور ان کے رنج والم اور حزن وکرب کا بوجھ کسی حد تک ہلکا ہوسکتا ہے۔ان کی زندگی کی کٹھنایاں گھٹ سکتی ہیں۔اس لیے آپ بیتی کو محض واقعات کی خشک کھتونی سمجھنا صحیح نہیں ہے بلکہ یہ ایک دستور العمل بھی ہے۔ یہ بات ہر دور میں اس کی اہمیت میں اضافہ کرتا رہے گا۔

بالعموم خودنوشتیں یا آپ بیتیاں نثر میں نظر آتی ہیں لیکن نثر کے برعکس ایسی کئی خودنوشتیں بھی ہیں جنہیں منظوم کیا گیا ہے۔اس قبیل کی اُردو خودنوشتیں میں واجد علی شاہ، داغ دہلوی اور منیر شکوہ آبادی کی منظوم آپ بیتیاں گنوائی جاسکتی ہیں۔عصر حاضر میں حمایت علی شاعر نے بھی نظم کی ہئیت میں اپنی خودنوشت لکھی ہے لیکن بعض ناقدین خودنوشت کے لیے نثر کی ہی قید لگاتے ہیں۔ان ناقدین میں ایک اہم نام یوسف جمال کا ہے، وہ اس حوالے سے اپنی رائے کا اظہار اس طرح کرتے ہیں:

"آپ بیتی اپنے حالات کو نثر میں لکھنا ہے۔یعنی بنیادی شرائط دو ہیں۔اول یہ کہ مصنف اپنے حالات خود لکھے دوسرے یہ کہ وہ حالات نثر میں ہوں۔" (۱۴)

لیکن معتدل رائے کے مطابق (راقم الحروف کا بھی یہی خیال ہے) ایسی قید اسکے مستقبل کے امکانات کو مخدوش بناسکتی ہے، ہاں البتہ یہ بات صحیح ہے کہ خودنوشت کے لیے نثر کا قالب ہی زیادہ بہتر ہے۔یہی آسان طریقہ بھی ہے جس میں اسے قلمبند کیا جاسکتا ہے۔یہی سبب ہے اُردو میں زیادہ تر خودنوشتیں نثر کی صورت میں ہی قلمبند نظر آتی ہیں۔

خودنوشت سوانح حیات میں کسی شخص کے جمیع احوال وکوائف کا تذکرہ مطلوب ومقصود نہیں ہوتا۔ یوں خودنوشت ایامِ حیات کی طرح داستانِ دراز بن جائے گی۔قارئین بھی اس طرح کا مفت میں دردسر لینا گوارا نہیں کرنا چاہیں گے۔اس لیے ان میں واقعات کے انتخاب کے حوالے سے مصنف کو بڑا ہی احتیاط پسند رہنا پڑتا ہے۔اس میں واقعات کی زمانی ترتیب اور تسلسل کو بھی ملحوظ نظر رکھا جانا چاہیے۔اس لیے جو بھی واقعہ مصنف اس میں پیش کرے وہ اس بات کا حد درجہ اہتمام کرے کہ وہ قارئین کے لیے کہاں تک جاننا ضروری ہے اور کس قدر وہ بات انکے لیے سودمند ثابت ہوسکتی ہے۔نیز یہ بھی غور کرے کہ وہ خود کس بات سے زیادہ متاثر ہوا ہے۔منتخب، متاثر کن اور محدود واقعات کو خودنوشت میں جمع کرنا ہی کامیابی کی ضمانت ہوتی ہے۔اس میں ترجیحی طور پر ایسے واقعات کو لازماً پیش کیا جانا چاہیے جن سے خودنوشت

نگار کا کردار جگمگا کر روشن نظر آئے اور اس کی شخصیت کے خدوخال نمایاں انداز میں قارئین کے سامنے اُبھر کر آئیں۔

آپ بیتی یا خودنوشت لکھتے وقت بڑی ہی احتیاط پسندی اور ہوش مندی سے کام لینا پڑتا ہے۔ یہ ایک طریقے سے ننگے جڑنے کا سا عمل ہے۔ یہاں یہ سوال اُٹھنا جائز ہے کہ پھر صداقت و حق گوئی کی نوعیت کیا ہو؟ کانٹ کا خیال ہے:

> ''سچ بات اچھی چیز ہے مگر یہ ضروری نہیں کہ ہر سچی بات کا اظہار اور اعلان بھی کیا جائے۔ احتیاط کے ضمن میں یہ بھی لازم ہے کہ اخفا کی ضرورت کو مدِ نظر رکھا جائے۔ ایسا سچ جو انتشار کا باعث ہو اسے مصلحتاً چھپا لینا ہی بہتر ہے۔ نازک معاملات میں راز کی بات ہم راز کو بھی نہیں بتانی چاہیے۔ آپ بیتی نگار کو یہ دیکھنا پڑتا ہے کہ کون سی بات ظاہر کی جا سکتی ہے اور کون سی بات پردے میں رکھنا موزوں ہے۔ جو بات بتائی جا سکتی ہے مخفی رکھنا خیانت ہے مگر ہر نجی بات کو سرِ عام پھیلا دینا دانشمندی نہیں۔ اب مسئلہ یہ رہا کہ آپ بیتی لکھنے والا اگر اپنے عیبوں کو گول کر جائے تو ظاہر بات ہے باقی صرف محاسن رہ جائیں گے۔ اس طرح آپ بیتی کتاب المناقب یا مدلل مداحی بن کر رہ جائے گی۔ اس لئے آپ بیتی لکھنا پلِ صراط پر سے گزرنا ہے۔ لہٰذا کسی کا یہ کہنا 'کیا کوئی شخص اپنی آپ بیتی لکھ سکتا ہے'؟ شاید نہ لکھ سکے گا یقیناً مبالغہ آمیز بات نہیں۔'' (۱۵)

## اُصولِ خودنوشت

خودنوشت نگار کے لیے ہیئت کی قید نہیں البتہ خودنوشت سے متعلق چند شرائط کا پایا جانا ضروری سمجھا جاتا ہے۔ جن میں ''صداقت و حق گوئی''، ''مصنف کی شخصیت'' اور ''فن'' ایسے معیارات ہیں جن سے کسی خودنوشت کا ادبی مقام متعین کیا جاتا ہے۔

### ا۔ سچائی

خودنوشت سوانح حیات کو رقم کرنے کی منشا انکشافِ ذات ہے یہ جبھی ممکن ہے جب خودنوشت

سوانح نگار راست بازی سے کام لے لیکن اس مرحلے پر مصنف کو کئی اندیشے بھی ستاتے ہیں اور اسے بہت سی باتوں کو مجبوراً گول کرنا پڑتا ہے۔ یوں کافی ساری حقیقتیں سامنے آجانے سے رہ جاتی ہیں جس سے مصنف کی ذات کا کماحقہٗ ادراک نہیں ہو پاتا۔ بقول شاعر:

افسوس صد ہزار سخن ہائے گفتنی

خوف فساد خلق سے نا گفتہ رہ گئے

یہ ایک حقیقت ہے کہ اس دُنیا شاید ہی کوئی ایسا شخص ملے کہ جس کا دامن اگر نچوڑا جائے تو فرشتے وضو کریں۔ یعنی خودنوشت نگار کو بہت سی باتیں چُھپانی ہی پڑتی ہیں لیکن لطف کی بات یہ ہے کہ یہاں سے قاری بھی کچھ اسی طرح کی باتوں کو ہی جاننے کی خواہش رکھتا ہے اور دلچسپی محسوس کرتا ہے۔ لہذا مصنف ’گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل‘ جیسی اُلجھن میں پڑ جاتا ہے، کہ جہاں کہیں مصنف حقیقت کا دامن چھوڑے تو فن کے ساتھ خیانت کا الزام آئے اور قارئین عدم دلچسپی کے شکار ہوں اور جہاں حقیقت کا انکشاف ہو جائے تو ممکن ہے کہ خلقِ خدا اسے پھر کہیں کا نہ چھوڑیں۔ اس تناظر میں شوکت تھانوی لکھتے ہیں:

”سچ بولنا دنیا میں سب سے بڑا گناہ ہے تمام دنیا کی تاریخ اُٹھا کر دیکھ لیجئے مصیبت میں آپ ان ہی کو مبتلا پائیں گے جو سچ بولنے والے گزرے ہیں۔ قانون ان ہی کا سب سے بڑا دشمن ہے.......... مختصر یہ کہ اگر دنیا کے اصول کو دیکھا جائے تو اس سے بڑھ کر اور حماقت کیا ہوسکتی ہے کہ ہم اپنی کمزوریوں کو پیش کریں۔ اب کہنے والا کوئی بھی نہ ہوگا کہ خدا نے اس کو سچ بولنے کی توفیق عطا کی۔“ (۱۶)

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بعض اوقات سچ کو آنچ کا سامنا کرنا پڑتا ہے لہذا اعتدال اور محفوظ راہ یہی ہے کہ مصنف نہ حقیقت کو مسخ کرنے کی کوشش کرے نہ ان واقعات کا تذکرہ کرے جن سے اُسے شدید خطرات یا فضیحت کا سامنا کرنا پڑے اور جو بہت نجی نوعیت کے معاملات ہوں۔ علاوہ ازیں اس چیز کا بھی دھیان رکھے کہ قارئین کے لیے کیا اور کتنا جاننا ضروری اور سودمند ہے۔ سچائی کی فقط خودنوشت میں یہی شرط ہے مانی جائے گی کہ جو حالات و واقعات بھی قلم بند کئے گئے ہوں وہ پوری دیانت اور سچائی کے ساتھ درج ہوئے ہوں۔ اس ضمن میں سر رضا علی لکھتے ہیں:

”دنیا میں وہ سچی بات بڑی مخدوش ہے جو آدھی ظاہر کی جائے اور آدھی چھپا ڈالی جائے۔

میرے نزدیک اپنے لکھے ہوئے سوانح حیات کی سب سے بڑی صفت یہ ہے کہ ایک مرتبہ کراماً کاتبین بھی سامنے آ کر بہ آواز بلند پڑھ لیں تو لکھنے والے کو آنکھ نیچی نہ کرنی پڑے۔'' (۱۷)

خودنوشت سوانح نگار بالعموم اپنی برائیوں کو چھپا کر اپنی اچھائیوں کو قاری کے سامنے رکھنے کی کوشش کرتا ہے لیکن جتنا خودنوشت نگار اپنی برائیوں، عیبوں اور نقائص کو عیاں کرتا ہے اتنا ہی ایک کامیاب سوانح نگار متصور ہوتا ہے اور وہی خودنوشت یا سوانح حیات ایک کامیاب اور کامل آپ بیتی کہلانے کی حق دار بنتی ہے کیونکہ انسان عیب و ہنر اور نیکی و بدی کا مرکب ہے اس لیے ہر طرح کے پہلو نمایاں ہونے ضروری ہیں لیکن سچائی کے نام پر جنسی بے راہ رویوں کا اظہار نا یا یاوہ گوئی کرنا کسی طور مستحسن عمل نہیں سمجھا جاسکتا۔ اسی طرح اپنی ولادت کے بارے میں بے جا مبالغہ آمیزی اور اس انداز سے تذکرہ کرنا کہ گویا عینی گواہ رہا ہو یہ بھی کسی طرح مناسب اور معقول بات نہیں ہے۔ ایسی غیر اخلاقی اور منفی باتیں جن سے جذبات برانگیختہ ہوں یا سماج پر بُرا اثر پڑے اس فعل شنیع سے بھی اجتناب کرنا بہتر عمل ہے۔ پروفیسر آل احمد سرور خودنوشت کی صفات کے بارے میں اپنی رائے کا اظہار اس حوالے سے ان الفاظ میں کرتے ہیں:

''خودنوشت سوانح لکھنا بظاہر بہت آسان ہے لیکن دراصل خاصہ مشکل ہے...... لکھنے والا اپنے ساتھ ایمانداری برتے۔ وہ نہ تو یہ کوشش کرے کہ اپنی تلخیوں، محرومیوں اور ناکامیوں کی داستان بیان کر کے اپنے دل کی بھڑاس نکالے، نہ اپنے آپ کو خلاصۂ کائنات سمجھ کر ہر شخص اور واقعہ پر ہمالہ کی بلندی سے تنقید کرے، نہ اپنا بُت بنا کر پیش کرے تا کہ لوگ اُس کی پرستش کریں اور نہ واقعات کو توڑ مروڑ کر اپنے کسی نظریے کے شکنجے میں دم بدم بدلتی ہوئی متضاد، رنگارنگ، حیرت انگیز جلوہ ہائے نو بہ نو سے معمور زندگی کو کسی اشتہار باز کی سرخیوں سے آلودہ کرے۔ جینا ایک فن ہے اور آپ بیتی ایک فن لطیف، اس سے عہدہ برآ ہونے کے لیے بڑی سچائی، بڑے ریاض اور بڑے کھرے پن کی ضرورت ہے۔ اس کا راستہ بھی پلِ صراط کی طرح بال سے باریک اور تلوار سے تیز ہے۔'' (۱۸)

غرض خودنوشت سوانح حیات کے لیے حقیقت نگاری جزو اعظم ہے۔ یہ خودنوشت کے لیے روح کی مانند ہے۔ اس کے بغیر کسی خودنوشت کی بقا ممکن نہیں۔ اس کی ساری دلنوازی و رعنائی اور اثر انگیزی

حقیقت نگاری پر منحصر ہے۔اس میں دروغ گوئی وخلافِ واقعہ باتیں عفونت سے پُر لاش کی مثل ہے۔

## ۲۔مصنف کی ذات

خودنوشت میں مرکز نگاہ کی حیثیت مصنف کی ذات ہوتی ہے۔اسی کے گرد ونواح کہانی کے ضمنی کردار و واقعات گھومتے ہیں۔مصنف پوری آپ بیتی کا خاکہ اپنی ذات سے ہی کھینچتا ہے۔یوں اپنی شخصیت کواس پُر اثر طریقے سے پیش کرنے کا دوسرا نام 'خودنوشت' ہے۔ایک اچھی خودنوشت ہمارے آگے شخصیت کی جاذب توجہ صورت رکھتی ہے جس میں زیست،حقیقت کے اس لباس میں بے حجاب فطری طرز میں آکھڑی ہوتی ہے جیسی کہ وہ بنی ہوتی ہے۔کسی شخص کی زندگی میں کئی واقعات ایسے ہوتے ہیں جن کا براہِ راست تعلق مصنف کی ذات سے ہوتا ہے۔اس نوع کے واقعات کوخودنوشت نگار قارئین کے سامنے اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ اسکا کردار واضح طور انکے سامنے پیش ہو،مزید براں اسکی پرداخت کس ماحول میں ہوئی ہے،اسے کیسا زمانہ نصیب ہوا تھا،اسکا نقشۂ منظر بھی مصنف قارئین کے سامنے رکھنا چاہتا ہے تاکہ وہ اسے اس تناظر میں بھی دیکھ کر سمجھنے کی کوشش کریں۔نتیجتاً اس طرح کے حالات وواقعات اور تجربات ومشاہدات سے نہ صرف خودنوشت نگار اپنے تفکرات وخصائصِ مزاج پیش کرتا ہے بلکہ پورے سماج اور عہد کی بھی تصویر کشی کرتا ہے۔

ایک اچھی آپ بیتی ایک ایسے آئینے کی مانند ہوتی ہے جس میں قاری اپنا عکس دیکھ سکےاور وہ اپنی شخصیت کا موازنہ مصنف کی شخصیت کے ساتھ کر کے اپنے لیے بہتر راستہ چُن سکے۔اس لیے کامیاب خود نوشت اُسی کو گردانا جاسکتا ہے جسکے مطالعے کا سفر مسرت سے شروع ہو کر بصیرت پر ختم ہو۔یوسف جمال کا بصیرت آمیز قول اس تناظر میں ملاحظہ کریں:

> ''وجودیت کے نقطہ نظر سے ہر ہستی الگ اور منفرد ہے۔جو روحانی واردات مجھ پر گزرتی ہے مجھ کو صرف اسی کا علم ہوسکتا ہے۔لیکن جس طرح ہر ذرے میں نظامِ شمسی کارفرما ہے اسی طرح ہر ہستی کے جذبات واحساسات کا مد وجزر بھی یکساں ہوتا ہے۔انسانیت کی قدر مشترک سب انسانوں میں موجود ہوتی ہے۔آپ بیتی ہر شخص کو آئینہ دکھاتی ہے۔مصنف کی

طرف سے نظر ہٹا کر قارئین خود اپنی طرف سے دیکھنے لگتے ہیں۔ یہ ایک عارفانہ منزل بھی ہے۔''(۱۹)

خودنوشت نگار ایک اچھی اور کامیاب خودنوشت میں خود کی شخصیت کو اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ اسکی شخصیت اوروں کے مقابلے میں بالکل منفرد اور نمایاں نظر آئے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے وہ خود کی تصویر میں شوخ رنگ کا استعمال کرتا ہے جبکہ اوروں کی تصویر دُھندلی رکھتا ہے۔ اگر ایسا کرنے میں اُسے کامیابی نہیں ملتی تو وہ آپ بیتی کم، جگ بیتی زیادہ ہو جائے گی اور وہ تخلیق خودنوشت کی صنف سے نکل کر تذکروں کی حدود میں شامل ہو جائے گی۔ لہذا خودنوشت کی کامیابی کا راز اسی میں مضمر ہے کہ وہ برسبیلِ تذکرہ معاشرے کے دیگر افراد کو اس میں شریکِ سفر کرے۔ اس طرح خودنوشت نگار کی ذات اور نکھر کے سامنے آئے گی۔ غرض انسان ایک سماجی جانور ہے وہ سماج میں رہتا ہے، اس لیے خودنوشت منطقی طور یہ تقاضہ کرتی ہے کہ معاشرے کے آثار بھی اس میں دکھائی دیں۔

## ۳۔فن

خودنوشت نہ صرف ایک اہم تاریخی دستاویز اور سماجی روایات اور مصنف کی داخلی اور خارجی زندگی کا آئینہ ہوتا ہے بلکہ اسکی ایک انفرادیت اس کا فن بھی ہے۔ 'فن' کی خودنوشت سوانح حیات کے اصولوں میں اپنی ایک اہم مرکزیت ہے۔ خودنوشت ادب کی ایک صنف ہے اور ادب فنونِ لطیف کی ایک فرع۔ لہذا اگر فن کو اظہار ذات کا دوسرا نام دیا جائے تو خودنوشت سے بہتر وسیلہ فن کے لیے اور کیا ہو سکتا ہے کہ جہاں پیدائش سے موت تک کے سارے حالات وواقعات شرح وبسط سے قلمبند کیے جاتے ہیں۔ صبیحہ انور خودنوشت کی اسی اہمیت کو باور کراتے ہوئے یوں رقمطراز ہیں:

''خودنوشت سوانح حیات کا تعلق ہمارے شدید داخلی جذبات سے ہے اس لیے اسے فن کی اعلیٰ اقدار میں شامل کیا جائے گا۔''(۲۰)

خودنوشت کا ایک اہم وصف صداقت شعاری اور راست بازی ہے۔ خودنوشت نگار اپنی زندگی کی مخفی ترین باتوں کے ساتھ ساتھ دیگر حالات وواقعات اور تجربات ومشاہدات کی خامہ کشی کر کے انہیں

قارئین کے سامنے پیش کر کے ایک طرح سے عمل اعتراف سے گزرتا ہے۔ دوسرے الفاظ میں خودنوشت سوانح عمری ''اعتراف نامہ'' بھی ہے۔ یوسف جمیل انصاری اس حوالے سے اپنی رائے کا اظہار کرتے ہوئے یوں لکھتے ہیں:

> ''آپ بیتی کو اعتراف نامہ کہنا بجا ہوگا۔ یہ لفظ مسیحی دینیات سے مستعار ہے۔ مسیحی کلیسا میں ہر شخص پر یہ لازم آتا ہے کہ وہ پادری کے سامنے اپنے حالات کا اعتراف کرے۔ اپنی غلطیوں کے اعتراف سے جو ندامت ہوتی ہے وہ گناہوں کو دھو دیتی ہے۔ اس طرح دیکھا جائے تو آپ بیتی انسان کی ندامت کا افسانہ ہے اس لئے آپ بیتی میں ایک گہرا عرفانی رنگ ملتا ہے۔'' (۲۱)

خودنوشت میں بے باکی وحق گوئی اپنی جگہ سر آنکھوں پر لیکن اگر اس میں مصنف ادبی حسن کا جادو جگانے میں ناکام رہا تو قارئین اس پھیکے پن کی وجہ سے عدم دلچسپی کے شکار ہو جائیں گے، اِلا یہ کہ بہت زیادہ کوئی اہم اور انوکھی بات قاری کو ورطہ حیرت میں ڈال دے۔ بہرصورت خودنوشت عام آدمی کی ہو یا ادیب وشاعر کی اس چیز سے قطع نظر کس کی ہے، اس میں ادبیت زیادہ اہمیت رکھتی ہے۔ اس لیے اسے کوئی قاعدہ کلیہ نہیں جاننا چاہیے کہ صرف ادیب وشاعر کی ہی خودنوشت، خودنوشت میں شمار ہوگی اوروں کی نہیں! یہ بات صحیح نہیں ہے۔ تخلیق میں حسن چاہے موضوع اور مواد کی ندرت سے آئے یا زبان وبیان کے تخلیقی برتاؤ سے، ہرصورت میں حسن کا ہونا ضروری ہے۔ یہی حسن خودنوشت کو ادب بناتا ہے اور لوگوں کی توجہ کا مرکز بھی۔

خودنوشت صنف کا کوئی بنا بنایا فارمولا نہیں ہے کہ جسکے اطلاق سے مصنف اپنی تحریر کو پر تاثیر اور خاطر نشین بنائے کیونکہ مصنفوں کی علمی استعداد، ادبی ذوق، مزاج ومیلان مختلف ہوتا ہے۔ تاہم مختلف خود نوشتوں کے مطالعے سے جو نتائج اور نکات اخذ ہوتے ہیں اور جو عمومی طور مشترک اُصول کارفرما رہتے ہیں وہ یوں ہیں:

ا۔ دل پسند پُر لطف اور پوشیدہ احوال کا بیان کرنا۔ ایسے حالات وواقعات اور ان سے نبرد آزما ہونے کا بیان کرنا جو بہت منفرد نوعیت کے ہوں۔ یہ ایسی چیزیں ہیں جو قاری کی توجہ اپنی طرف مبذول کرانے میں

کامیاب ہوتی ہیں۔

۲۔اپنی تحریر کو پسندیدہ خاطر اور بہتر بنانے کے لیے چست جملے لکھنا،تشبیہات واستعارات کا برمحل استعمال کرنا،تلمیحات واساطیر کا سہارہ لینا۔مذہبیات،اخلاقیات،اقوال،اشعار جیسی چیزوں سے اسکے حسن میں اضافہ کرنا،موقع ومحل سے متانت اور طنز ومزاح کا اُسلوب اختیار کرنا۔غرض ان جیسے اور دیگر شعری وسائل کو بروئے کار لانا تا کہ نثر بدمزگی کا احساس نہ کراکے علمی اور تخلیقی بن جائے۔

قصّہ کوتاہ یہ کہ خودنوشت کا کوئی مخصوص اُسلوب اور اُصول نہیں ہے۔پس یہ مصنف کے مزاج کے رنگ،موضوع ومواد کی ندرت اور اہمیت پر انحصار کرتا ہے۔یہی چیزیں خودنوشت کو فن بنا دیتی ہے جس کے بغیر کسی بھی ادبی صنف کا تصور نہیں کیا جاسکتا۔

## محرکاتِ خودنوشت

ہر ایک تخلیق کے پس پشت عوامل یا وجہِ تخلیق ضرور ہوتی ہے۔یہ کیسے ممکن ہے کہ دُھواں بھی اُٹھے اور دِل نہ جلا ہو!اسی طرح خودنوشت تخلیق کرنے کے پیچھے بھی کچھ اسباب،کچھ عوامل ایسے ضرور رہتے ہیں جنکی وجہ سے یہ وجود میں آئی ہوتی ہے۔یہ ضروری نہیں کہ سب خودنوشتوں کا محرک مشترک ہو لیکن یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ خودنوشت کا کوئی محرک ضرور ہوتا ہے۔ذیل میں کچھ ایسے ہی مقاصد یا محرکات کو بیان کیا جارہا ہے جو خودنوشت کے پسِ پردہ بالعموم ہوتے ہیں:

۱۔اپنی ذات سے انتہائی محبت یا بالفاظ دیگر خودپسندی وخود پرستی۔

۲۔شدید نفسیاتی دباؤ اور انا کی تسکین۔

۳۔غلط فہمیوں کا ازالہ اور خود پر لگے الزامات کی صفائی۔

۴۔اپنے تجربات سے اوروں کو روشناس کرانا۔

۵۔اپنے ساتھ ہوئے سانحات اور ان سے جڑے اثرات کا ذکر کرنا۔

۶۔اپنے عہد میں ہونے والی سیاسی،سماجی،معاشی،سائنسی،ادبی،مذہبی،تعلیمی،طبی وغیرہ معاملات کے اصل حقائق سے لوگوں کو واقف کرانا یا اپنا نقطۂ نظر اس حوالے سے پیش کرنا۔

۷۔اپنی زندگی سے متعلق اہم شخصیات اورایک دوسرے پر پڑے اثرات کا ذکر کرنا۔

۸۔اپنے ماحول،تعلیمی نظام،سماجی اورملکی دستور،ملکی حکومتوں،رسم ورواج،مذہبی ومسلکی نظریات یاادبی و تنظیمی وابستگی کے خود پر پڑے اثرات کا ذکر کرنا۔

۹۔اپنے گناہوں پر پچھتاوااوراعتراف جرم کرکے احساس جرم کے جذبات سے نجات حاصل کرنا۔

اس بات میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ خودنوشت سوانح حیات میں شخصیت اہم درجہ رکھتی ہے مگر اس سے بھی اہم تر بات یہ ہے کہ سوانح نگار نے بھرپورطریقے سے زندگی جی ہواوروہ بتائے لمحوں کو پوری دیانت وایمانداری کے ساتھ لکھنے کا حوصلہ رکھتا ہو۔کیونکہ جب انسان کی عمر کا پیمانہ لبریز ہونے کو آتا ہے تو ایسے میں جب وہ پیچھے مڑکراپنی سابقہ زندگی کو یاد کرتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اسے حسرت وپشیمانی کے سوا کچھ زیادہ نہیں ملتا لہٰذا اس خفت ومحرومی کے ساتھ ایک تو پہلے ہی زندگی گزارنا مشکل عمل ہے دوسرا اوروں کے سامنے یہ پیش کرنا بڑے ظرف کی بات ہے کیونکہ کہیں نہ کہیں اس کے اظہار میں عزت نفس کے ساتھ سمجھوتہ کرنا پڑتا ہے۔محمد طفیل ایک جگہ اس بارے میں یوں اظہارِرائے فرماتے ہیں:

> ''میرے نزدیک کسی کا مرنا اور جینا اس مقصد اوراس کے کام پر منحصر ہوتا ہے۔جتنے لوگ چل پھر رہے ہیں۔مجھے انہیں زندہ سمجھنے میں تامل ہے اور جتنے لوگ مرے ہوئے ہیں مجھے انہیں مردہ سمجھنے کا کوئی حق نہیں۔''(۲۲)

اسی طرح یوسف حسین خان بھی اس نکتہ کی مزید صراحت اس طرح کرتے ہیں:

> ''آپ بیتی لکھنے والے کے پیش نظر زندہ اورمرے ہوئے دونوں ہوتے ہیں اس کی یادوں کی بستی میں دونوں پہلو بہ پہلو نظر آتے ہیں یہ ضرور ہے کہ اس کے نزدیک بعض زندہ مرے ہوئے سے زیادہ بے حقیقت اور بعض مرے ہوئے زندوں سے زیادہ حقیقی ہوتے ہیں۔''(۲۳)

محولہ بالا اقتباس پر غور کرنے سے یہ حقیقت عیاں ہو جاتی ہے کہ جن لوگوں کی زندگی کسی مقصد سے عاری ہوتی ہے وہ زندہ ہونے کے باوجود بھی زندہ نہیں ہیں اور جنہوں نے اپنی زندگی کسی خاص مقصد کے لیے وقف کردی ہو وہ بعد از مرگ بھی زندہ وجاوید ہوتے ہیں اورلوگوں کے دلوں میں بستے ہیں۔یا یوں کہنا بھی مناسب ہوگا کہ وہ زندہ شمار ہونے کا بعد ازمرگ بھی پوراپوراحق رکھتے ہیں۔ایسے لوگوں کی

اگر خودنوشت ہو تو صحیح معنوں میں وہی زندگی کے اصل مفہوم سے شناسائی کراتی ہے اور بعد کی نسلوں کے لیے صحیح جانب راہنمائی میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

مختصر یہ کہ خودنوشت سوانح حیات ذاتی شئے ہوتی ہے اس میں مصنف اپنی زندگی سے منسلک اور اپنے عہد کے حالات و واقعات کو اٹوک طریقے سے پیش کرتا ہے۔خودنوشت عرفان اور محاسبۂ ذات و کائنات کا نام ہے۔اس بنا پر شخصیت کی اہمیت خودنوشت میں امر لازم بن جاتی ہے اس کے بغیر خودنوشت لکھنا ممکن ہی نہیں ہے۔

## خودنوشت سوانح حیات کی اقسام: بلحاظِ سوانحی تکمیل و ہیئت

اُردو خودنوشت سوانح نگاری کے متعلق اہلِ ادب کی آرا مختلف ہیں اور اسکی کوئی حتمی تعداد متعین نہیں کی گئی ہے۔ذیل میں بلحاظِ ہیئت اسکی چند اہم مشترکہ اور مسلمہ اقسام کو بیان کیا جارہا ہے تاکہ اسکے تمام خدوخال مکمل طور سے واضح ہو جائیں۔

سوانحی تکمیل کی رو سے خودنوشت سوانح حیات دو حصّوں میں تقسیم کی جاتی ہے۔مکمل خودنوشت اور نامکمل خودنوشت۔

### مکمل خودنوشت

اس طرح کی خودنوشت میں مصنف آغاز سے انجام تک اپنی زندگی کو وضاحت کے ساتھ بیان کرتا ہے۔اپنے ہر خاص پہلو پر ترتیبِ زمانی کے اعتبار سے جانکاری فراہم کراتا ہے۔ایسی خودنوشت مصنف کے جذبات و احساسات، تجربات و مشاہدات اور افکار و اقدار کا ایک مکمل آئینہ ہوتا ہے۔اس قبیل کی خودنوشتوں میں ''اعمال نامہ''، ''خون بہا''، ''ناقابلِ فراموش''، ''یادوں کی دنیا''، '' یادوں کی بارات''، اور ''شہاب نامہ'' کے نام قابلِ ذکر ہیں۔

## نامکمل خودنوشت

نامکمل خودنوشت سوانح حیات میں مصنف کی زندگی کے تمام واقعات کے برعکس چند چیدہ چیدہ واقعات کا بیان ملتا ہے۔اس میں زندگی کے ایک یا چند مثلاً ادبی ،سیاسی ،علمی زندگی کا ذکر یا اپنے کئے گئے سفروں کا بیان بھی کیا جاتا ہے۔غرض اسکا مقصد زندگی کے کسی اہم کارنامے کو قارئین تک پہنچانا ہوتا ہے۔ اس قسم کی خودنوشت سوانح عمریوں میں ’’کالا پانی‘‘،’’میرا افسانہ‘‘،’’داستانِ غدر‘‘،’’آپ بیتی‘‘،اور ’’زرگزشت‘‘ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

## مکتوباتی خودنوشت

مکتوبات انکشافِ ذات کا مؤثر وسیلہ ہے۔اس کے ذریعے سے انسان اپنی داخلی اور خارجی زندگی میں ہونے والے اہم احوال کا ذکر کرتا ہے۔اس مماثلت کی بنا پر اسکی حدیں تو خودنوشت سے جاملتی ہیں لیکن اس کی تنگ دامنی انسان کے جمیع حالات وکوائف کو اپنے اندر سمونے کی وسعت نہیں رکھتی ہے۔ اردو میں سرسید کے خطوط ،مکاتیبِ غالبؔ ،خطوطِ شبلیؔ ،مولانا ابوالکلام آزادؔ کے خطوط اسی طرح حالیؔ، اقبالؔ، اکبرؔالہ آبادی، مولوی عبدالحق، مہدی افادیؔ اور عبدالماجدؔ دریا آبادی کے مکاتیب اہم مقام رکھتے ہیں۔ان تمام مکتوبات میں خودنوشت کے بہترین عناصر موجود تو ہیں لیکن اسکے باوجود بھی ہم انہیں تکنیکی طور سے خودنوشت نہیں کہہ سکتے ہیں۔

## تذکراتی خودنوشت

تذکرہ میں کسی اہم شخصیت کے حالات وواقعات کا ذکر مختصر طور ہوتا ہے۔اسے سوانح حیات کے متبادل طور پر بھی دیکھا جاتا ہے۔اُردو کے تذکرہ نگاروں نے اس صنف کو فروغ بخش کر فن کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔میر تقی میرؔ، مصحفیؔ، میر حسنؔ اور محمد حسین آزادؔ کے تذکروں کی وجہ سے ہمیں نہ صرف بہت سی ادبی شخصیات کی زندگی کو جاننے کا موقع ملتا ہے بلکہ کبھی صاحبِ تصنیف کی بھی زندگی ،پسند ، ناپسند کے

بارے میں بہت جانکاری ملتی ہے۔ یہاں یہ بات بھی اہم ہے کہ کبھی کبھی شدت سے بعض معلومات کی کمی کا احساس ان تذکروں سے ہوتا ہے جس کی ایک اہم وجہ مشرقی روایات میں سے عجز و انکساری کے عنصر کا پایا جانا ہے۔ یہی سبب ہے کہ کھل کر تذکرہ نویسوں نے اپنی ذات کے بارے میں کہنے سے گریز کیا ہے اور بہت سی اہم معلومات اس احساس کی نذر ہو گئی ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوا ہوتا تو سوانحی ادب کو تذکرہ نگاری سے خوب فائدہ پہنچا ہوتا۔ بہر حال ہم کہہ سکتے ہیں کہ ان کی وجہ سے خودنوشت صنف کا راستہ کھلا اور یہ صنف تذکرہ نگاری کی بھی مرہونِ منّت ہے۔

### منظوم خودنوشت

اردو میں بیشتر خودنوشتیں نثر کی ہیئت میں ہیں لیکن اردو شاعری خودنوشت کے رنگ سے بالکل خالی بھی نہیں ہے۔ دیگر اصنافِ شعری کے ساتھ ساتھ کچھ سوانحی مثنویاں بھی ہیں جیسے ''قطب مشتری''، ''گلشن عشق''، ''علی نامہ''، ''حزنِ اختر'' وغیرہ۔ جن میں خودنوشت کا رنگ جھلکتا ہے۔ اس تناظر میں اگر دیکھیں تو محسوس ہوتا ہے کہ اردو ادب میں نظم کی ہیئت کو بھی خودنوشت کے طور پر اپنایا گیا ہے لیکن اس تجربے کے باوجود خودنوشت نے نثر کے جامہ کو ہی زیادہ پہننا پسند کیا ہے۔

## اقسامِ خودنوشت باعتبارِ موضوع و مواد

موضوع اور مواد کے حوالے سے خودنوشت کو کئی اقسام میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔ جیسے مذہبی خودنوشت، سوانح تاریخی خودنوشت، افسانوی خودنوشت اور ادبی خودنوشت۔ اختصار کے ساتھ یہاں مذکورہ خودنوشتوں کی انواع کا ذکر کیا جاتا ہے تا کہ اس کے خدوخال نمایاں اور واضح ہو جائیں۔

## مذہبی خودنوشت سوانح

مذہبی خودنوشت سوانح، ہم اس خودنوشت کو کہتے ہیں جس میں مصنف اپنی زندگی کے بارے میں جانکاری فراہم کرانے کے ساتھ ساتھ کئی مذہبی معاملات میں اپنی رائے اور انکی تشریح بھی کرتا ہے۔اس میں محاسبۂ نفس اور عرفانِ ذات کا گہرا جذبہ بھی پایا جاتا ہے۔ایسی خودنوشت عمومی طور مذہبی لوگ ہی لکھتے ہیں۔ان خودنوشتوں میں مصنف تجرباتِ روحانی، مشاغلِ طریقت، طریق مجاہدات نیز رموزِ معرفت کی باتیں قلمبند کرتا ہے۔علمائے دین کی خودنوشتوں سے فقہی مسائل پر بھی روشنی پڑتی ہے۔اس طرح کی خود نوشتوں میں مذہبی معاملات کا مقصد زیادہ ملحوظِ نظر رہتا ہے۔گوکہ اس شخص کے عہد کے ادبی، سیاسی، سماجی، تہذیبی وغیرہ حالات کا بھی علم موجود ہوتا ہے لیکن ان حالات وواقعات کی حیثیت ضمنی ہوتی ہے۔

ڈاکٹر وہاج الدین علوی مذہبی خودنوشت پر روشنی ڈالتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''مذہبی خودنوشت میں مصنف اپنے حالاتِ زندگی مذہبی جذبہ کے تحت قلم بند کرتا ہے اور اس کا بنیادی محرک خوداظہاریت کے ساتھ تبلیغ دین اور تحدیثِ نعمت بھی ہوتا ہے۔''(۲۴)

مذہبی خودنوشتوں میں اور ایک چیز جو مشترک نظر آتی ہے وہ عقیدت کا پہلو ہے۔ایک مصنف کو ہمیشہ غیر جانبدارانہ رویہ اختیار کرنا چاہیے اور صداقت و تجزیے سے کام لینا چاہیے، لیکن اس چیز کی کمی کا احساس عبرتناک اور حیرت ناک حد تک مذہبی خودنوشتوں میں ملتا ہے۔

## تاریخی خودنوشت سوانح

عموماً ہر خودنوشت سوانح میں کچھ نہ کچھ تاریخی عناصر ضرور پائے جاتے ہیں لیکن اگر کوئی خودنوشت نگار، تاریخ کو دیگر موضوعات اور معاملات پر مقدم رکھتا ہے تو ایسی خودنوشت سوانح عمری کو تاریخی خود نوشت کہا جائے گا۔باوجودیکہ خودنوشت سوانح کسی دور کی خشک تاریخی کھتونی نہیں ہوتی بلکہ یہ خودنوشت نگار کی ذات پر بھی مشتمل ہوتی ہے۔اس میں کسی عہد کے صرف ظاہری حالات و واقعات ترتیبِ زمانی سے پیش نہیں کیے گئے ہوتے ہیں بلکہ ان حالات کے جذباتی، نفسیاتی، حسیاتی، اور باطنی پہلوؤں کو بھی نمایاں کیا گیا ہوتا ہے۔یہ وہ پہلو ہیں جو کسی عہد کی تاریخ اور تاریخی خودنوشت کو ایک دوسرے سے مختلف

بناتے ہیں۔

## سیاسی وسماجی خودنوشت

یہ خودنوشت کی وہ قسم ہے جہاں ادیب اپنی زندگی کے سیاسی، سماجی حالات تحریر میں لاتا ہے۔اس نوع کی خودنوشتیں بہ لحاظِ معلومات کافی اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ان خودنوشتوں میں مصنف کی ذات سے متعلق اہم گوشوں جیسے پیدائش، خاندانی حالات، بچپن اور تعلیم وتربیت کی معلومات برسبیلِ تذکرہ اور برائے نام کی اگرچہ ہوتی ہیں لیکن اس کے برعکس ان میں سیاسی وسماجی حالات اور اس سے جڑے افراد کی طرف زیادہ توجہ مرکوز رہتی ہے۔اُردو میں اس قبیل کی خودنوشتوں میں سر رضا علی کی ''اعمال نامہ'' اور چودھری افضل حق کی ''میرا افسانہ'' قابل ذکر ہیں۔یہ اپنے عہد کی سیاسی ہنگامہ آرائیوں پر مبنی اہم دستاویز تصور کی جاتی ہیں۔

مجموعی طور پر ہم سیاسی وسماجی خودنوشت سوانح، ایسی خودنوشتوں کو کہیں گے جو مصنف کے سیاسی شعور اور سیاسی کارناموں کی دستاویز ہو اور جس میں خودنوشت نگار کی دیگر خارجی اور غیر سیاسی نیز داخلی زندگی کا بھی پرتو دکھائی دیتا ہو۔

## افسانوی خودنوشت سوانح

جب کوئی ادیب اپنی زندگی کو راست طریقے کے بجائے افسانوی تکنیک کے ذریعے پیش کرے تو ایسی تحریری کہانی افسانوی خودنوشت کا رُوپ دھار لیتی ہے۔تعجب ہے کہ اُردو میں ہنوز کسی ناقد نے افسانوی خودنوشت سوانح کی اصطلاح جاری نہیں کی ہے! ہاں البتہ اس سلسلے میں سوانح ناول کی اصطلاح ضرور مستعمل ہے۔حیرانگی کی بات ہے کہ افسانوی خودنوشت سوانح کو بھی اسی طرح قیاس کیا جانا چاہیے تھا اور یہ اصطلاح رائج ہو جانی چاہیے تھی۔سید شاہ علی کے ذیل کے اقتباس سے اس امر کی طرف ترغیب ملتی ہے۔وہ ایک جگہ لکھتے ہیں:

''اٹھارویں صدی میں انگریزی ناول کے آغاز وارتقا میں سوانح نگاری کا زبردست ہاتھ رہا ہے۔ جبکہ شروع میں تو اس کی حیثیت بالکل سوانح نگاری کی ایک شاخ سی تھی۔ 'ڈینیل ڈفو' وہ شخص تھا جس نے اس طریقے کو ترقی دی۔ اس کی ''رابنسن کروسو'' کو ایک محض افسانوی آپ بیتی قرار دیا جاتا ہے۔''(۲۵)

مذکورہ بالا اقتباس سے یہ انکشاف ہوتا ہے کہ سید شاہ علی افسانوی آپ بیتی کی اصطلاح اگرچہ ناول کے بارے میں استعمال کرتے ہوئے نظر آتے ہیں، اسی طرح کسی شخص کی روداد زندگی کی افسانوی پیشکش کو افسانوی خودنوشت سوانح کے نام سے بھی موسوم کیا جانا چاہیے تھا۔

افسانوی خودنوشت سوانح کے کردار حقیقی ہوتے ہیں اور وہ مصنف کے وضع کردہ پلاٹ کے قالب میں ڈھلے ہوئے نہیں ہوتے ہیں۔ اس میں جن اشخاص کا ذکر ہوتا ہے وہ حقیقت کے بہت زیادہ قریب رہتے ہیں، صرف مصنف انہیں افسانوی تکنیک سے مزیّن کرتا ہے۔ اُردو میں اس طرح کی آپ بیتیوں کا اچھا خاصہ سرمایہ موجود ہے۔ چنانچہ ہادی رسوا کا ناول ''امراؤ جان ادا''، سجاد کسمنڈوی کا ناول ''نشتر''، عصمت چغتائی کا ناول ''ٹیڑھی لکیر'' اور قرۃ العین حیدر کا ناول ''کارِ جہاں دراز ہے'' ایسی خودنوشت سوانح آپ بیتیاں ہیں جنھیں افسانوی خودنوشت سوانح کہنا زیادہ مناسب ہوگا۔ یہ اور بات ہے کہ اُردو میں اس کے لیے سوانحی ناول جیسی اصطلاح ابھی تک مستعمل نہیں ہے۔

## ادبی خودنوشت

ادبی خودنوشت ایسی خودنوشت کو کہا جاتا ہے جس کا مصنف عموماً کوئی ادیب، شاعر یا فن کار ہوتا ہے۔ اس نوع کی خودنوشت میں سیاسی، سماجی، ادبی اور ثقافتی ہر طرح کے رنگ ملتے ہیں۔ یہ دیگر انواعِ خودنوشت میں زیادہ جامع اور اہم تصور کی جاتی ہے۔ اسکی یہ اہمیت، ادبیت کی وجہ سے ہوتی ہے۔ دیگر اقسام کی خودنوشتوں کے مصنف اپنے اپنے میدان کے شہ سوار ہوتے ہیں اور یہ حقیقت ہے کہ جس فن کا جو ماہر ہوتا ہے اس کی زندگی میں اس چیز کا اثر غالب رہتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ شاعر یا ادیب کی خودنوشتوں میں ادب کی پوری جلوہ آرائی ملتی ہے کیونکہ یہ انکا اپنا میدان ہوتا ہے۔ مذہبی، سیاسی، تاریخی شخصیات

اپنے مزاج ومیلان اور استعدادِعلمی کے ساتھ اپنی خودنوشت قلمبند کرتے ہیں جبکہ ادیب اور شاعر کی خودنوشت زبان و بیان کے جملہ اوصاف اور لوازمات کا مجموعہ ہوتی ہے۔اس حوالے سے ڈاکٹر وہاج الدین علوی کی رائے صائب معلوم ہوتی ہے۔وہ لکھتے ہیں:

''ادبی خودنوشت سے میری مراد ان خودنوشتوں سے ہے جن میں سیاسی، مذہبی اور سماجی عناصر تو ضرور پائے جاتے ہیں لیکن یہ عناصر کمزور ہوتے ہیں اور ادبی اندازِنظر، ادبی مسائل، افکار اور اشخاص کے اثرات غالب رہتے ہیں............ادبی خودنوشت، خودنوشت کے سارے لوازم کو پورا کرتی ہے۔ایسی خودنوشتوں کے خالق شاعر، ادیب اور فنکار ہوتے ہیں۔یہ تصانیف زبان و بیان کے لحاظ سے بھی بہتر ہوتی ہیں۔بعض اوقات ان کی مدد سے بڑے بڑے علمی اور ادبی مسئلے حل ہو جاتے ہیں۔جب کوئی شاعر یا ادیب ادبی دنیا کا کوئی واقعہ تحریر کرتا ہے تو اس کے محرکات پر بھی حتی الوسع روشنی ڈالتا ہے اور اس دور کے ادبی مزاج کو سامنے لاتا ہے۔''(۲۶)

المختصر! ادبی خودنوشت ایک ایسا آئینہ ہوتا ہے جس میں مصنف کی ذات اور اسکا عہد پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوتے ہیں۔اسکا مطالعہ ادب، ادیب اور عہدفہمی کے لیے نئے دریچے وا کرتا ہے۔

# اُردو میں خودنوشت سوانح حیات کی روایت (ایک اجمالی تعارف)

عہدِ پارینہ کے مشترکہ ہندوستان میں خودنوشت سوانح نگاری کا چلن نہیں تھا۔ اس عہد میں اگر اس قسم کی کوئی شئے ملتی بھی ہے تو وہ ادب کے زمرے میں شامل نہیں کی جاسکتی۔ اس کی با ضابطہ روایت ہمیں مسلم دورِ حکومت سے ملتی ہے۔ مثال کے طور پر التمش، تیمور اور بابر وغیرہ کی خودنوشتیں۔ مگر یہ فارسی زبان میں لکھی گئی ہیں۔ ان خودنوشتوں سے ہندوستان میں قدرے اس صنف کی جانب میلان بڑھا اور ترغیب ملی۔ ہندوستان میں جب اردو زبان عوامی اور سرکاری بول چال کی حیثیت سے اُبھری اور اس نے اپنا سکہ جمایا تو اقوال، ملفوظات، دکن کی مثنویوں جیسے ''گلشن عشق''، ''علی نامہ'' اور دوسرے منظومات میں گو خودنوشت سوانح کے آثار ملنا شروع ہوئے تاہم اب بھی اس صنف کا باضابطہ فنی طور تکمیل کا سفر دور تھا۔ میر تقی میرؔ نے ۱۷۷۰ء کے آس پاس اپنی خودنوشت بنامِ ''ذکرِ میر'' لکھی بھی تو فارسی میں۔ اس خودنوشت کے قریب نوے سال تک بھی اردو کو کوئی خودنوشت نصیب نہیں ہوئی، پھر ہم ۱۸۵۷ء کے بعد اُردو کے ادیبوں اور شاعروں کا میلان اور دلچسپی اس صنف کی جانب دیکھتے ہیں۔ اس ضمن میں ڈاکٹر وہاج الدین علوی رقمطراز ہیں:

> ''میر تقی میر کی خودنوشت کے بعد تقریباً نوے برس تک کسی خودنوشت کا سراغ نہیں ملتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں کسی کو سوانحی ادب سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس جمود کے تاریخی اور نفسیاتی عوامل جو بھی ہوں لیکن حقیقت یہ ہے کہ غدر ۱۸۵۷ء کے بعد پھر سے ادیبوں اور شاعروں نے اس طرف توجہ دی۔'' (۲۷)

غرض اردو میں اسکی عمر زیادہ لمبی نہیں ہے۔ انیسویں صدی کے آخر میں اسکے ابتدائی نمونے نظر آنا شروع ہوجاتے ہیں۔ تاہم جلد اس نے ترقی کے منازل طے کیے اور بیسویں اور اکیسویں صدی میں اسکا خاطر خواہ سرمایۂ ادب وجود میں آگیا۔

# آزادی سے پہلے اردو میں خودنوشت

اُردو میں خودنوشت سوانح حیات کے ابتدائی آثار ہمیں سب سے پہلے اُردو کی منظوم داستانوں مثلاً "گلشنِ عشق"، "علی نامہ" (نصرتی) وغیرہ میں نظر آتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے آس پاس لکھی جانے والی واجد علی شاہ کی منظوم آپ بیتی بھی اس حوالے سے اہمیت رکھتی ہے۔ لیکن اب بات آتی ہے اُردو کی اولین خودنوشت کی، تو اس بات میں اختلاف ہے کہ آیا اردو کی خودنوشت مولانا جعفر تھانیسری کی "تواریخِ عجیب" (کالا پانی) ہے یا عبدالغفور نساخ کی "آپ بیتی"۔ وہاج الدین علوی "کالا پانی" کو جہاں اُردو کی سب سے پہلی خودنوشت قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اردو میں سب سے پہلے شائع ہونے والی خودنوشت "تواریخ عجیب" (کالا پانی) ۱۳۰۲ھ میں منظر عام پر آئی۔" (۲۸)

تو وہیں ڈاکٹر مظہر مہدی عبدالغفور نساخ کی خودنوشت "آپ بیتی" کو اوّلیت کا سہرا دیتے ہیں اور اس کے سنہ تصنیف کو ۸۷-۱۸۸۶ء قرار دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

> "اُردو میں اب تک دستیاب خودنوشتوں میں عبدالغفور نساخ کی سوانح عمری کو اولیت حاصل ہے۔ اس کا سنہ تصنیف معلوم نہیں ہو سکا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ ۸۷-۱۸۸۶ء کے درمیان لکھی گئی ہوگی کیونکہ اس میں ۱۸۸۵ء تک کے حالات درج ہیں۔" (۲۹)

ڈاکٹر صبیحہ انور کا خیال بھی کچھ اسی طرح کا ہے۔ وہ اس ضمن میں لکھتی ہیں:

> "نساخ نے اپنی آپ بیتی ۱۸۸۶ء تک ہی لکھی تھی کیونکہ ۱۸۸۶ء کے آگے کے حالات یا واقعات نہیں ملتے۔ لہٰذا ۱۸۸۶ء اس نامکمل آپ بیتی کا سالِ ترتیب قرار دیا جا سکتا ہے۔" (۳۰)

ایک اور رائے کے مطابق جو ڈاکٹر معین الدین عقیل کی ہے، شہر بانو بیگم کی "بیتی کہانی" اردو کی اولین خودنوشت ہے۔ ان کی تحقیق "بیتی کہانی" کے بارے میں یہ کہتی ہے کہ اسے مئی ۱۸۸۵ء میں تصنیف کیا گیا تھا لیکن دیباچے کے اضافے کے ساتھ پھر اسے کتابی صورت میں تقریباً ڈیڑھ سال بعد

شائع کیا گیا۔ بہر حال محتاط رائے کے مطابق مولانا جعفر تھانیسری کی خودنوشت ''کالا پانی'' ہی اُردو کی اب تک کی اولین خودنوشت معلوم ہوتی ہے۔

۱۹۱۰ء میں ''داستانِ غدر'' کے نام سے ظہیر دہلوی کی خودنوشت شائع ہوئی۔ جیسا کہ نام سے ہی ظاہر ہے اس میں ۱۸۵۷ء کے اندوہ ناک حالات کا ذکر موجود ہے۔ یہ خودنوشت خصوصاً اہلیانِ دہلی، بادشاہ، امرا و شرفا کی حالت زار کے واقعات پر مبنی ہے۔ ظہیر دہلوی کی خودنوشت ''داستانِ غدر'' کے بعد ''تذکرہ غوثیہ'' شائع ہوئی۔ یہ مذہبی مزاج کی خودنوشت ہے جس میں تصوف اور اس سے متعلق باتوں کا ذکر ملتا ہے۔ اس کے بعد خواجہ حسن نظامی کی خودنوشت ''آپ بیتی'' کا نام آتا ہے جسے خواجہ حسن 'عرفانِ ذات کا بہی کھاتہ' کہتے ہیں۔ یہ ۱۹۱۹ء میں شائع ہوئی۔ ان جیسی خودنوشتوں نے مذہبی خودنوشت کی فکر کو فروغ بخشا۔ ''آپ بیتی'' کے تقریباً ۲۳ سال بعد یعنی ۱۹۴۲ء میں سر رضا علی کی خودنوشت ''اعمال نامہ'' منظر عام پر آئی۔ اس خودنوشت کی انفرادیت و اہمیت یہ ہے کہ اس میں پہلی بار فنِ خودنوشت نگاری کے اُصولوں کو برتا گیا ہے۔ نیز اسکی یہ بھی خصوصیت ہے کہ اس میں ادبی رجحانات اور سیاسی پس منظر کو بھی پیش کیا گیا ہے۔ اودھ کے سیاسی، ادبی منظر نامے کے ساتھ ساتھ اس میں مصنف کے حالاتِ زندگی کو بھی مکمل احاطے میں لایا گیا ہے۔ ۱۹۴۲ء میں ہی ایک اور خودنوشت حکیم شجاع کی ''خون بہا'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اسکے بعد مزید فنِ خودنوشت نگاری اور اسکی روایت کو ترقی ملی۔ ''خون بہا'' (۱۹۴۲) کے بعد پے در پے کچھ خودنوشتیں شائع ہوئیں جن میں وزیر سلطان جہاں بیگم کی ''نیرنگیٔ محبت'' اور فلمی دنیا سے جڑی ایک اور ادا کارہ بملا کماری کی ''ایک ایکٹرس کی آپ بیتی'' کے نام قابلِ ذکر ہیں۔ ''نیرنگیٔ محبت'' میں سماج کے اعلیٰ طبقے کے لوگوں کا رہن سہن، انکے معاملات مسائل اور صنفِ نازک کے جذبات کی عکاسی ملتی ہے۔ ''ایک ایکٹرس کی آپ بیتی'' میں ایک دوشیزہ کی ادا کارہ بننے کی تلخ روداد بیان کی گئی ہے اور فلمی دنیا کے پیچھے کا گندہ اور مذموم چہرہ دکھایا گیا ہے، کہ اس شعبے میں کتنا استحصال ہوتا ہے۔ چودھری افضل حق کی خودنوشت ۱۹۴۳ء میں ''میرا افسانہ'' کے نام سے چھپ کر سامنے آئی۔ یہ خودنوشت ایک ایسے محبِ وطن کی قربانیوں کی داستان ہے جس نے انگریزوں کے ظلم و استبداد کے خلاف بغاوت کی علم بلند کی تھی۔

# آزادی کے بعد اُردو میں خودنوشت

آزادی کے فوراً بعد جو خودنوشت شائع ہوئی وہ نواب سعید خان چھتاری کی ''یادِ ایام'' ہے۔نواب چھتاری نے اپنی ساٹھ سال زندگی کے اہم واقعات کا ذکر بڑی تفصیل کے ساتھ دو جلدوں میں کیا ہے۔ اسی زمانے میں مولانا حسین مدنی نے اپنی خودنوشت ''نقشِ حیات'' سے خودنوشت کے سرمایے میں نہایت اہم اضافہ کیا۔ یہ خودنوشت اپنے دور کی سیاسی ہنگامہ آرائیوں کی عکاس ہے نیز اس میں علمائے دیوبند کا بھی تفصیل کے ساتھ ذکر ملتا ہے۔۱۹۴۷ء کے بعد کی اہم ترین خودنوشتوں میں ''نا قابلِ فراموش'' کو بھی فراموش نہیں کیا جاسکتا ہے۔ یہ دیوان سنگھ مفتون کی کل صحافتی زندگی کے تجربات کا نچوڑ ہے۔اسکا اُسلوب اور بے باک طرز قارئین کی توجہ کو اپنی جانب مبذول کرانے میں کامیاب ہوتا ہے۔الہ آباد یونیورسٹی کے مایہ ناز استاد ڈاکٹر سید اعجاز کی ''میری دنیا'' میں بھی ایک دنیا آباد ملتی ہے۔اس میں ادب، عمرانیات، نفسیات اور تاریخ کا ایک خوب صورت سنگم نظر آتا ہے۔اسی عہد کی ایک اہم خودنوشت عبدالمجید سالک کی ''سرگزشت'' ہے۔ یہ خودنوشت ہمیں ہندوستان اور پاکستان کی اہم سیاسی، سماجی، علمی، ادبی تحریکات ور جحانات کے متعلق جانکاری پیش کراتی ہے، لیکن اس میں وارداتِ قلبی اور احساساتِ لطیف کی کمی کا احساس قارئین شدّت سے کرتے ہیں۔۱۹٦۷ء میں ڈاکٹر یوسف حسین خان کی خودنوشت ''یادوں کی دُنیا'' منظرِ عام پر آئی۔اس خودنوشت کی اہم خاصیت یہ ہے کہ مصنف نے اپنے بیانات اور دعوؤں کو مستند بنانے کے لیے دلائل اور حوالے دیے ہیں۔ یہ خودنوشت مصنف کی شخصیت اور نفسیات کو سمجھنے میں بے حد معاون ہے۔ظفر حسین ایبک کی خودنوشت ''آپ بیتی'' کے نام سے ۱۹٦۴ء میں اشاعت پذیر ہوئی۔ مصنف نے اس میں اپنی ذات کے علاوہ افغانستان اور روس کے مابین سیاسی حالات پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ ۱۹٦۵ء میں عبدالطیف بجنوری اور عبدالغفار مدھولی کی خودنوشتیں علی الترتیب ''لطیف کی کہانی'' اور ''ایک طالبِ علم کی کہانی'' کے نام سے شائع ہوئیں۔۱۹۷۰ء میں اُردو دنیا

کی سب سے مشہور خودنوشت ''یادوں کی بارات'' شائع ہوئی۔ یہ تہلکہ انگیز تصنیف شاعر شباب و انقلاب جوش ملیح آبادی کی ہے۔ اس خودنوشت نے صنفِ خودنوشت کو نئی بلندیاں عطا کیں۔ یہ خودنوشت جوش کی لا اُبالی طبیعت کے پس پردہ نفسیاتی اُلجھنوں اور گرہوں کو سمجھنے میں بہت مدد دیتی ہے۔ ۱۹۷۱ء میں ''لاہور کا جو ذکر کیا'' شائع ہوئی۔ یہ گوپال متل کی خودنوشت ہے۔ اس خودنوشت میں لاہور کے ادبی ماحول کا جو نقشہ کھینچا گیا ہے وہ متاثر کُن ہے۔ ۱۹۷۲ء میں منظر عام پر آنے والی خودنوشتوں میں شورش کاشمیری کی ''بوئے گل نالۂ دل دودِ چراغ محفل'' اہمیت کی حامل ہے، اس میں شورش کاشمیری کی سیاسی اور مذہبی زندگی کی دلچسپ روداد قارئین کو اپنی طرف مائل کرنے میں کامیاب ہوتی ہے۔ رشید احمد صدیقی طنز و مزاح کا ایک اہم نام ہے۔ اس صاحبِ انشا پرداز کی خودنوشت ''آشفتہ بیانی میری'' کے نام سے منظر عام پر آئی۔ اس میں انہوں نے اپنی درس و تدریس کی زندگی اور علی گڑھ کی علمی فضا کا بڑی خوبصورتی کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ ''مجھے کہنا ہے کچھ اپنی زبان میں'' خواجہ غلام السیدین کی خودنوشت ہے جو ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔ علی گڑھ کی سرزمین سے انہیں بھی کافی لگاؤ تھا۔ اس خودنوشت میں بچوں کی نفسیات اور توہمات کے اثرات پر کافی روشنی ڈالی گئی ہے۔ بے وقت موت کی وجہ سے وہ '۱۲' ابواب مکمل نہ کر کے صرف '۳' ابواب پر ہی اپنی زندگی کی داستان رقم کر کے اس دنیا سے چلے گئے۔ ۱۹۷۴ء میں ''یادوں کے سائے'' شائع ہوئی یہ عتیق احمد صدیقی کی خودنوشت ہے۔ اس میں ایران و مصر کی تاریخ و تہذیب کے دلچسپ پہلو بیان کیے گئے ہیں۔ نسائی ادب کی چوتھی خودنوشت ''آزادی کی چھاؤں میں'' ہے۔ یہ بیگم انیس قدوائی کی رودادِ زندگی ہے، جو ۱۹۷۴ء میں شائع ہوئی۔ اس خودنوشت سے عورتوں کی نفسیات سمجھنے میں خوب مدد ملتی ہے۔ علاوہ بریں یہ بھی اندازہ ہوتا ہے کہ ان میں کتنی سیاسی صلاحیتوں کا امکان موجود ہوتا ہے۔ ''آزادی کی چھاؤں میں'' کے بعد اُردو شاعری کے عظیم شاعر احسان دانش کی خودنوشت ''جہانِ دانش'' کے نام سے ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی۔ یہ خودنوشت مصنف کے تخلیقی سفر کے ساتھ ساتھ انکے اہم حالات و واقعات کی داستان ہے۔ اُردو کے ایک اور بلند پایہ عالم اور جامع الحیثیت شخصیت عبدالماجد دریا آبادی کی خودنوشت ''آپ بیتی'' ۱۹۷۸ء میں منظرِ عام پر آئی۔ اس میں مصنف کے حالات و واقعات کے علاوہ مختلف النوع کارناموں کا تذکرہ ملتا ہے۔ کنور مہندر سنگھ بیدی کی خودنوشت ''یادوں کا جشن'' کے نام سے

شائع ہوئی، یہ جوش ملیح آبادی کی خودنوشت سے متاثر ہوکر لکھی گئی خودنوشت معلوم ہوتی ہے۔ بیدیؔ نے اس میں اپنے اکہتر سالہ حالات زندگی کے ساتھ ساتھ اپنے ادبی مشاغل اور مجلسی زندگی کے احوال کا بھی بیان کیا ہے۔ خواتین خودنوشت نگاروں میں صالحہ عابد حسین کی ''سلسلۂ روز وشب'' بڑی اہم تصور کی جاتی ہے۔ یہ خودنوشت ۱۹۸۴ء میں شائع ہوئی۔ یہ کتاب صالحہ عابد کی انتھک محنت، فعال ذہن اور حوصلوں کی آئینہ دار ہے۔ ڈاکٹر وزیر آغا کی خودنوشت ''شام کی منڈیر سے'' ۱۹۸۶ء میں شائع ہوئی۔ اس میں مصنف نے اپنی زندگی کے ساٹھ سالہ کے اہم واقعات کا احاطہ بڑی خوبصورتی کے ساتھ زیب قرطاس کیا ہے۔ بیسویں صدی کے ربع آخر میں منظرِ عام پر آنے والی خودنوشتوں میں کشور ناہید کی ''بُری عورت کی کتھا'' (۱۹۹۶) اور اختر الایمان کی ''اس آباد خرابے میں'' (۱۹۹۶) نے خودنوشت کے سرمایۂ ادب میں گراں قدر اضافہ کیا۔ ''بری عورت کی کتھا'' میں مسلم قدامت پسند معاشرے پر چوٹ کی گئی ہے ساتھ میں سماج میں عورتوں کے حقوق تلف کیے جانے کے واقعات اور سماجی طبقاتی اور جنسی عدم مساوات کے پہلوؤں کو اُجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ''اس آباد خرابے میں'' اختر الایمانؔ نے اپنی زندگی کے تلخ واقعات کا بے باکی سے ذکر کیا ہے، انہوں نے اپنی طالبِ علمی کے زمانے، فلمی دنیا، ازدواجی زندگی کی کشمکش، اپنی غربت وافلاس، خانہ بدوشی کی زندگی غرض زندگی کے سبھی پہلوؤں کو بڑی دیانت اور صداقت شعاری سے بیان کیا ہے۔ اسی طرح اداؔ جعفری کی خودنوشت ''جو رہی سو بے خبری رہی'' ۱۹۹۵ء، انتظار حسین کی ''چراغوں کا دھواں'' (۱۹۹۹)، قدرت اللہ شہاب کی ''شہاب نامہ'' ۲۰۰۳ء، وہاب اشرفی کی ''قصّہ بے سمت زندگی کا'' ۲۰۰۸ء، عابد سہیل کی ''جو یادرہا'' ۲۰۱۲ء، ایسی خودنوشتیں ہیں جو بہت مقبول ہوئیں۔ یہ خودنوشتیں اپنے زمانے کی بہترین آئینہ دار ہیں۔

اُردو میں خودنوشت سوانح کے اس اجمالی جائزے سے یہ اندازہ بخوبی ہو جاتا ہے کہ اس کی تاریخ قریب ڈیڑھ سو صدی پر پھیلی ہوئی ہے۔ اس کے آثار قدیم اُردو کے ابتدائی دور میں منثورات اور منظومات دونوں میں ملتے ہیں لیکن اسکا باقاعدہ آغاز انیسویں صدی کے آخر سے ہوتا ہے۔ اس نے ترقی کے منازل بیسویں صدی کی چوتھی دہائی سے طے کرنا شروع کیں اور اسی زمانے میں اس نے رفتار بھی پکڑی۔ خودنوشت کی صنف اب بھی ترقی کے زینے تیزی سے چڑھ رہی ہے اور آج بھی مختلف شعبہ ہائے

زندگی سے وابستہ حضرات اس صنف کو اپنے تجربات، مشاہدات، محسوسات، عقائد ونظریات اور افکار و خیالات پیش کرنے کے لیے ایک اہم وسیلہ کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔

## خودنوشت کی نفسیاتی اہمیت

ہر صنف ادب کی طرح خودنوشت کی بھی اپنی ایک الگ انفرادیت اور اہمیت ہے۔ خودنوشت کا یہ خاصہ ہے کہ یہ ایک ادیب سے آدھی سے زیادہ ملاقات کراتی ہے۔ دیگر شعری اور نثری ادب سے قارئین کو ایک مغالطہ لگ سکتا ہے یا انہیں یہ اشتباہ ہوسکتا ہے کہ ایسا ادب لکھنے کے پیچھے کیا ادیب کی زندگی اور اسکے خیالات کارفرما ہیں یا اس نے اوروں کی زندگی کو صفحہ قرطاس پر بکھیرا ہے یا ایسے ہی اختراعی واقعات وخیالات پر مبنی کچھ لکھا ہے جس سے مصنف کی ذات کا کوئی سروکار نہیں ہے۔ لیکن خودنوشت کا معاملہ اسکے برعکس ہے کیونکہ یہ خودنوشت نگار کے قلم سے لکھی ہوئی خود کی رودادِ زندگی ہوتی ہے۔ اس میں مطمحِ نظر مصنف کی ذات ہی ہوتی ہے اور صداقت کا بھی سب سے زیادہ غالب امکان اسی صنف میں موجود رہتا ہے۔

خودنوشت کسی مصنف کے مرحلہ وار واقعات اور حادثات کا خشک دفتر نہیں ہوتا، بلکہ اس کے توسط سے اس کے نہاں خانوں میں جھانکنے اور اس کے مخفی پہلوؤں کا مشاہدہ کرنے کا بھی موقع ملتا ہے۔ اس سے ادیب کی طبیعت، اس کی فطرت، اس کی ذہنیت، اس کی دبی اور اُلجھی ہوئی خواہشات اور نفسیات اور اس کی پیچیدہ شخصیت کے خدوخال کا بصیرت آمیز تجزیہ اور مطالعہ ممکن ہو جاتا ہے۔ خودنوشت سماج کے اہم اشخاص کی زندگی کے متعلق ہی اکثر ہوا کرتی ہے جیسے یہ سماجی، سیاسی، ادبی، تعلیمی، مذہبی وغیرہ حلقوں سے وابستہ ایسے افراد پر مبنی ہوتی ہے، جو اپنے شعبوں میں کامیاب ترین ہوتے ہیں۔ سماج میں انکا ایک نام ہوتا ہے اس لیے زندگی کے بارے میں انکا تجربہ اور انکی آرا نہایت ہی سودمند مانی جاتی ہے انکے بارے میں لوگ جاننا اور پڑھنا دلچسپ مشغلہ سمجھتے ہیں۔ نفسیاتی پہلو کی بات کریں تو خودنوشت کے مطالعہ

سے ادیب کی زندگی کے تمام نشیب وفراز کو نفسیاتی نظر سے دیکھنے کا سب سے بہتر موقع ملتا ہے کیونکہ مصنف اپنی کہانی خود بیان کررہا ہوتا ہے اور خود سے بہتر انسان کسے سمجھ سکتا ہے اور کس کی کہانی بیان کرسکتا ہے؟ خودنوشت نگار اپنی زندگی کے نہاں خانوں پر پڑے تقریباً سارے پردے اُٹھا دیتا ہے یعنی بقول شخصے اپنا کلیجہ کاغذ پر نکال کر ڈال دیتا ہے۔ اس میں مصنف نہ صرف اپنا محاسبہ کرتے ہوئے ہر ایک عمل کی ایک نفسیاتی توجیہہ شعوری یا غیر شعوری طور سے پیش کرتا ہے بلکہ زندگی کے اہم ترین واقعات وحادثات کی داستان بھی قلم بند کرتا ہے جو فخر و پشیمانی، امید وبیم، حسرت و یاس اور افسوس وسرخوشی کی ایک دنیا پر آباد ہوتی ہے۔ اسی کی بدولت قارئین کو یہ موقع بھی ملتا ہے کہ وہ نفسیاتی اعتبار سے مصنف کو جانچ سکے اور اسکے ادب کے پس پشت عوامل، موضوعات اور الفاظ کے انتخاب اور فکری رجحان کی وجوہ جان سکے جس سے فن کی تفہیم مزید آسان ہونے میں مدد مل سکتی ہے۔ یوں مصنف کی مختلف نفسیاتی گرہوں پر روشنی بھی پڑتی ہے۔ مصنف کے عادات واطوار، رہن سہن، نظریات، مشاغل اور پسند ناپسند کا رشتہ اس کی نفسیات سے منسلک ہوتا ہے بغیر اس نفسیاتی ادراک کے، ادب فہمی اور عہد فہمی کا تعین امر محال بن جاتا ہے۔ ڈاکٹر تنویر علوی خودنوشت کی نفسیاتی اہمیت کے بارے میں اس طرح کے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> ''سوانح عمریوں کا مطالعہ ہمیں مختلف ادوار کی نفسیات کو سمجھنے میں مدد دیتا ہے اور مختلف افراد کے حالاتِ زندگی اور اُفتادِ مزاج کو بھی۔ اگر بہ نگاہِ غور دیکھا جائے تو سوانحی ادب کے مطالعے کے بغیر ہم ایک زمانے کی تاریخ، اس کی فنی روایت، تہذیبی شعور اور تاریخی ارتقاء کا مطالعہ بھی نہیں کرسکتے۔'' (۳۱)

الغرض خودنوشت صرف کسی فرد واحد کی ذات کی نفسیات کی عکاس ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ اپنے عہد کی نفسیاتی کشمکش کی آئینہ دار بھی ہوتی ہے۔ لہذا ان کا مطالعہ ادب شناسی، ادیب شناسی اور عہد شناسی کو مزید بہتر طریقے سے سمجھنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ اس سے قارئین بھی اپنے آپ اور اپنے عہد کا موازنہ خودنوشت نگار اور اس کے عہد کے ساتھ کرکے ایک معتدل اور صحت مند راستہ پانے میں کامیاب ہوسکتے ہیں۔ یہی وہ بنیادی خصوصیات ہیں جن کی وجہ سے خودنوشت کی نفسیاتی اہمیت مسلم ہوجاتی ہے۔

☆☆☆☆☆

# حوالہ جات

(۱) oxford advanced learner's dictionary of current english,oxford university press,1998(fifth edition)page.68

(۲) Roy Pascal ,Design and truth in autobiography,pagr Bro .,London,1960,p9

(۳) انسائیکلوپیڈ یا برٹینکا،حصہ دوم ص:۱۰۰۹

(۴) Cassell"s Encyclopedia of World Literature,Cassell & company Ltd., London,1973,p,74.

(۵) Encyclopedia America Essays on biography and Auto biography Grolier incorporated,vol,2.p,803

(۶) گوپی چندنا رنگ۔بیسویں صدی میں اُردو ادب،ساہتیہ اکادمی ۲۰۰۲،نئی دہلی،ص ۳۳۶

(۷) رفیع الدین ہاشمی،اصناف ادب،لاہور،سنگ میل پبلی کیشنز،طبع سوم،۱۹۸۲ء،ص ۶۲

(۸) محمد طفیل ''تصریحات''نقوش آپ بیتی نمبر،لاہور،۱۹۶۴،ج ا،ص ۴۲

(۹) عبدل مجید قریشی ''آپ بیتی اردو ادب میں''مشمولہ سہ ماہی الزبیر،آپ بیتی نمبر،بہاولپور،اردو اکیڈمی ۱۹۶۴ء،ص ۲۹

(۱۰) وہاج الدین علوی،اردو خودنوشت۔فن وتجزیہ،دہلی جامعہ ملیہ اسلامیہ،۱۹۸۹ء،ص ۴۱

(۱۱) آل احمد سرور۔خواب باقی ہیں،لاہور،فکشن ہاؤس ۱۹۹۴ء،ص ۸

(۱۲) ظل ہما،صادق الخیری حیات اور ادبی خدمات،نئی دہلی۔شاہد پبلی کیشنز ۱۹۹۷ء،ص ۴۷۔۲۷۳

(۱۳) صبیحہ انور،اُردو میں خودنوشت سوانح نگاری،لکھنؤ،نامی پریس،۱۹۸۲ء،ص ۳۷

(۱۴) یوسف جمال، آپ بیتی اور اسکی مختلف صورتیں، مشمولہ نقوش۔آپ بیتی نمبر، جلد اول (لاہور)، ۱۹۶۴
ص ۳۲۰

(۱۵) جمیل احمد، سیاق وسباق، لاہور، عمر پبلیشرز، ۱۹۹۵ء، ص ۴۷

(۱۶) شوکت تھانوی، مابدولت، لاہور، ادارہ فروغ اردو، بار سوم ۱۹۴۹ء، ص ۱۱

(۱۷) رضا علی، اعمال نامہ، لاہور، فکشن ہاؤس ۱۹۹۵ء، ص ۱۳

(۱۸) آل احمد سرور۔خواب باقی ہیں، لاہور، فکشن ہاؤس، ۱۹۹۴ء ص ۹، ۸

(۱۹) یوسف جمال انصاری، آپ بیتی اور اسکی مختلف صورتیں، نقوش آپ بیتی نمبر، لاہور، جلد اول ۱۹۶۴ء،
ص ۸۳

(۲۰) صبیحہ انور۔اردو میں خودنوشت سوانح حیات، نامی پریس لکھنؤ ۱۹۸۲ء، ص ۳۷

(۲۱) یوسف جمال انصاری، نقوش، آپ بیتی نمبر، لاہور ۱۹۶۴ء، ص ۴۷

(۲۲) محمد طفیل ''تصریحات'' نقوش۔آپ بیتی نمبر ۱۰۰ شمارہ، رسالہ لاہور ۱۹۶۴ ص ۴۲

(۲۳) یوسف حسین خاں ''یادوں کی دنیا''، غالب اکیڈمی دہلی ۱۹۶۷ء ص ۱۲

(۲۴) وہاج الدین علوی، اُردو خودنوشت، فن و تجزیہ، ص ۴۸

(۲۵) ڈاکٹر سید شاہ علی، اُردو میں سوانح نگاری، گلڈ پبلیشنگ ہاؤس، کراچی، ۱۹۶۱ء، ص ۹۶

(۲۶) وہاج الدین علوی، اُردو خودنوشت فن و تجزیہ، ص ۵۰

(۲۷) ڈاکٹر وہاج الدین علوی، اُردو خودنوشت فن و تجزیہ، ص ۴۱۷

(۲۸) اُردو خودنوشت فن و تجزیہ، ص ۴۱۸

(۲۹) بیسویں صدی میں اُردو ادب، ص ۳۳۶

(۳۰) اُردو خودنوشت سوانح حیات، ص ۱۸۶

(۳۱) ڈاکٹر تنویر احمد علوی، مقدمہ، مشمولہ اُردو میں فن سوانح نگاری کا ارتقاء (مصنفہ ڈاکٹر ممتاز فاخرہ)، رونق
پبلشنگ ہاؤس، دہلی، ۱۹۸۴ء، ص ۹